اردو میں ژاک دریدا کی سوانح: چند تسامحات پر ایک نظر

Jacques Derrida's Biography in Urdu: A Glance on Tolerances

خرم شہزاد، پی ایچ ڈی سکالر، بہالدین الذکریا یونیورسٹی ملتان
قاضی عابد، پروفیسر، بہالدین الذکریا یونیورسٹی ملتان

Abstract

There is little work in Urdu criticism on Jacques Derrida's (1930-2004) biography. However, there are a few such essays that object and question his life. These questions in Urdu have Yet not been completely answered in researched and logical ways. Most of the questions in objections raised in the essays about Derrida pertain to his biographical rather than ideological domains. So, the objections raised are answered in this essay in biographical grounds and ideological objections on ideological grounds. The research methodology has been kept logical and analytical to make the representation of facts correct to the most possible extent.

Keywords: Jacques Derrida, Biography, Fallacy, Johns Hopkins Conference, Jew, Phonocentrism

انسانی فکر کے لیے بیسویں صدی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اس صدی کا نصف اول فسطائیت کے مختلف حوالوں کے ساتھ دو عالمی جنگوں کی خون آشامی رکھتا ہے۔ تو نصف آخر مذکورہ انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مغربی فکر میں تہہ در تہہ پیچیدگی لیے ہوئے ہے۔ عدم یقین نے اس دور میں مغربی فہم کو اکہرا نہ رہنے دیا۔ مغربی فکر میں پیدا ہونے والی اسی کثیر الجہتی نے ژاک دریدا کے فلسفے کی شکل میں افلاطون سے ہیگل، ہسرل اور ہائیڈیگر تک کو نیا فلسفیانہ تناظر فراہم کیا۔ جس سے ادب کی تفہیم بھی متاثر ہوئی۔ چنانچہ دریدا نے فن کا تجزیہ کرتے وقت موضوع کو داخل اور خارج تک محدود سمجھنے کے بجائے منظّم کرنے والے ہر ضابطے ہی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ (Jacques Derrida 1987,45) مغربی فضا میں فکری پیچیدگی ہی کی وجہ سے نت نئے اعلانات سنائی دینے لگے۔ 1960ء میں ڈینیئل بیل نے نظریے کے خاتمے (Daniel Bell 1960,17) 1979ء میں فرانکوایس لیوتار نے مہابیانیے کے خاتمے (Jean Francois Lyotard 1984,XXIV) اور 1989ء میں فوکویاما نے تاریخ کے خاتمے (Francis Fukuyama 1992,XI) کا اعلان کر دیا۔ لفظ اعلان سے جس قدر سرسری پن کا تاثر ابھر سکتا ہے۔ ایسا کوئی تاثر ان مغربی اعلانات کی بنیاد نہیں تھا۔ بلکہ پیچیدہ فکری صورتِ حال کو (تمام تر جزئیات کے باوجود) کلیت میں یک رخا دکھانے کا التباس ہی ان اعلانات کی اساس بنا۔ ان اعلانات کے محرکات کس حد تک

سیاسی وسماجی تھے؟اس سوال کے جواب کا یہ محل نہیں۔

مغربی ادب، فلسفے اور صورتِ حال کے حوالے سے یہ تجزیے باقاعدگی سے نوے کی دہائی میں اردو تنقید کا موضوع بنے۔اردو میں ان موضوعات پر لکھنے والوں نے طویل تناظرات کو ایک ایک کتاب میں سمونے کی کوشش کی۔وہ فکری ضابطے جو مغرب میں مختلف النوع اور بعض اوقات تو متضاد سمجھے گئے تھے۔اردو تنقید میں ان مباحث کا اولین پیش کار بننے کی غرض سے انہیں ایک ہی کتاب میں یک جا کر دیا گیا۔ان کوششوں کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تنقیدی کتابوں کی نوعیت تنقیدی یا تجزیاتی نہ رہی۔حالاں کہ اردو تنقید میں ان مباحث کے پیش کار مغربی تناظر نہ رکھتے تھے اور یہ بات کوئی کم اہم نہ تھی۔کیوں کہ کسی صورتِ حال سے دوچار ذہن اس حد تک معاملہ فہم نہیں ہوسکتا جس حد تک مشاہدہ کرنے والا دوسرا(Other) ذہن ہوسکتا ہے۔چنانچہ اگر یہ لوگ چاہتے تو ادبی تھیوری کا محض تعارف کرانے کے بجائے ان مباحث کا تجزیہ اور تحلیل کر کے ان کے عقب میں موجود حرکیات کو واضح کر سکتے تھے۔یہی وہ وقت تھا جب اپنی فہم کو معتبر کیا جاسکتا تھا۔ایسا اب تک ہوسکا یا نہیں اس سوال کا حتمی جواب دینے کے بجائے غور کرنا چاہیے کہ اردو میں ادبی تھیوری سے موسوم سمجھی جانے والی کتب کو کس ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا۔پھر اس تلاش میں چاہے ہم ایسے مضامین تک ہی کیوں نہ پہنچ جائیں جو شدید اختلاف لیے ہوئے ہیں۔البتہ اختلاف کی نوعیت خالصتاً علمی ہونی چاہیے نہ کہ ذاتی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا شمار اردو کے اہم ناقدین میں ہوتا ہے۔یوں تو انہوں نے ادبی تھیوری کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے مگر اس ضمن میں خاص طور پر 1993ء میں شائع ہونے والی ان کی کتاب ''ساختیات ،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' کو اہمیت دی جاتی ہے۔کیوں کہ وہ اس موضوع پر پہلی مربوط اور باقاعدہ کتاب ہے۔اس کتاب میں ساختیات اور پسِ ساختیات کو موضوع بنانے کے بعد ان حوالوں کی مطابقت مشرقی شعریات سے قائم کی گئی ہے۔اپنی اشاعت کے بعد سے ہی اردو کے مختلف علمی حلقوں کی طرف سے اس کتاب کو موضوع بنایا جا چکا ہے۔اس کتاب کے مندرجات سے تائید یا تردید کا ایک طویل سلسلہ ہے۔اسی سلسلے کی ایک کڑی پروفیسر فضیل جعفری کا طویل مضمون ہے۔یہ مضمون دو حصوں میں بعنوان:''ساختیاتی کباب میں ردِتشکیل کی ہڈی'' اور''تھیوری:امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت''ان کی کتاب:''آبشار اور آتش فشاں''میں شامل ہے۔اس مضمون میں مختلف دلائل کی مدد سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب کے مندرجات سے اختلاف کیا گیا ہے۔پروفیسر فضیل جعفری نے نہ صرف ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے اختلاف کیا ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے:''نارنگ نے ساختیات اور پسِ ساختیات کے ضمن میں جن مغربی مفکرین کے قصیدے پڑھے ہیں ان کی تحریروں پر بھی ادبی ایجنڈے سے کہیں زیادہ سیاسی ،ثقافتی اور فلسفیانہ ایجنڈا حاوی دکھائی دیتا ہے۔''(پروفیسر فضیل جعفری ۲۰۰۷،۲۸۸)فضیل جعفری صاحب کی رائے سے بالکل واضح ہے کہ انہوں نے بالواسطہ گوپی چند نارنگ''ساختیات،پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات'' میں موضوع بننے والے مغربی مفکرین کو سیاسی ،ثقافتی اور فلسفیانہ ایجنڈے کا پرچارک بتایا

ہے۔اور پھر پروفیسر صاحب کے مضمون کے دوسرے حصے کا عنوان :''تھیوری:امریکی شوگر ڈیڈی اور مابعد جدیدیت'' بھی ان کے اسی خیال کی بازگشت ہے۔عین ممکن ہے ان کی یہ بات درست ہو۔تاہم ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ مغربی مفکرین میں سے ایک ژاک دریدا تک خود کو محدود کر کے اس حوالے سے ہم پروفیسر فضیل جعفری کی رائے کا تحقیقی جائزہ لیں۔تا کہ پروفیسر صاحب کے بیان کی صحت کو جانچا جا سکے۔یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مطالعے کو ژاک دریدا تک اس لیے محدود کیا جا رہا ہے۔کیوں کہ ایک مضمون میں کسی ایک ہی مفکر کے حوالے سے اس طرح لکھا جا سکتا ہے کہ اس کی سوانح سے مطلوبہ حقائق دستیاب ہوں اور ہم کسی نتیجے تک پہنچ سکیں۔اس ضمن میں کسی نتیجے تک پہنچنا اس لیے ضروری ہے کہ اول تو اردو تنقید میں مذکورہ مغربی مفکر کی زندگی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔اگر پروفیسر صاحب کی تحریر ہے بھی سہی تو دریدا کے حوالے سے اس میں سنگین الزامات لگائے گئے ہیں۔چنانچہ ان کی صحت کو جانچنا ضروری ہے۔

پروفیسر فضیل جعفری کی طرف سے دریدا اور اس کی فکر سے متعلق جو الزامات عائد کیے گئے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

1۔ دریدا نے خود اپنی تحریروں خصوصاً "Sendings" میں اعتراف کیا ہے کہ وہ یہودیت میں بڑی کشش محسوس کرتا ہے۔اور اس نے یہودی ہونے کی وجہ سے ہی مغربی روایت پر حملے کیے ہیں۔(پروفیسر فضیل جعفری ۲۰۰۷،۳۲۰)

2۔ دریدا نے تقریر/ تحریر والی فوق ترتیب کے حوالے سے مغربی فلسفے پر بے بنیاد اعتراض اٹھایا ہے۔کیوں کہ جب سے آدمی نے لکھنا سیکھا ہے تقریر کی فوقیت از خود ختم ہو گئی ہے۔تحریر کے مقابلے میں تقریر کو کبھی بھی سند کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔(پروفیسر فضیل جعفری ۲۰۰۷،۳۲۳)

3۔ دریدا فلسفیانہ تربیت کے باوجود فلسفے کا استاد نہیں تھا بلکہ صرف اس کمیٹی کا رکن تھا جس کا کام فلسفے کی نصابی کتابیں تیار کرنا تھا۔(پروفیسر فضیل جعفری ۲۰۰۷،ص:۳۲۸)

4۔ اکتوبر 1966ء میں منعقد ہونے والی جان ہاپکنز یونیورسٹی کی کانفرنس کو جے ہلس ملر اور پال دی مان نے امریکی سرمایہ دار ہنری دوئم کے حکم سے منعقد کیا تھا۔(پروفیسر فضیل جعفری ۲۰۰۷،۳۳۴۔۳۳۳)

5۔ چونکہ اس سارے کھیل کے پیچھے امریکی اسٹبلشمنٹ براہِ راست موجود تھی اس لیے تھیوری اور رد تشکیل کو کتابوں کے ذریعے ہی نہیں اخباروں اور میگزین کے ذریعے بھی خوب اچھالا گیا۔(پروفیسر فضیل جعفری ۲۰۰۷،۳۳۸۔۳۳۷)

درج بالا پہلے نکتے میں دریدا کی جس تحریر "Sendings" کی بنیاد پر اس کے لیے متعصب یہودی کا تاثر ابھارا گیا ہے۔اس تحریر کا مکمل نام:"Sending: On Representation" ہے۔اس تحریر کے بغور مطالعے

کے بعد پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک مقالہ ہے نہ کہ سوانحی عناصر کی حامل کوئی تحریر۔ اس مقالے میں کہیں بھی اس کے یہودی ہونے کا اعتراف نہیں ہے بلکہ اس کا آغاز ہنری برگساں کی اس رائے سے کیا گیا ہے جس میں اس نے لفظ میں معنی کی نمائندگی کا خیال پیش کیا ہے۔ برگساں کی رائے سے دریدا اپنی بحث کا آغاز کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ فرض کریں فرانسیسی زبان مر چکی ہے۔ اس زبان کا کوئی جملہ ہمیں آرکائیو میں کسی پتھر، کاغذ یا مائیکرو فلم پر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ کیا ہم اپنے عہد میں رہتے ہوئے اس جملے کے اصل معنی تک پہنچ پائیں گے؟ اس سوال کے ذریعے وہ کسی بھی لفظ یا جملے میں معنی کی نمائندگی سے بحث کرتا ہے۔(JacquesDerrida Summer 1992,295) اس مقالے میں اگلے تیس صفحات پر وہ مخصوص فلسفیانہ انداز میں نمائندگی (Representation) کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے بیشتر فلسفیوں کی آراء سے استفادہ کر کے زبان میں معنی کی نمائندگی کے کلاسیکی اور جدید تصور کے درمیان مطلوبہ فرق قائم کر لیتا ہے۔ اور معنی کی نمائندگی کو Trace کا قائم مقام بنا دیتا ہے۔(Jacques Derrida Summer 1992,325-326) انتہائی مختصر انداز میں ہم نے دریدا کی تحریر کے مندرجات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس تحقیق کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ثابت کیا جائے ژاک دریدا یہودی نہیں تھا بلکہ اصل مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ خاندانی پس منظر کے ساتھ وہ یہودی ہی تھا۔ تاہم شدت پسند یا متعصب نہیں۔ جیسا کہ پروفیسر فضیل جعفری صاحب نے اس پر الزام عائد کیا۔ اس حوالے سے مزید شواہد کی غرض سے ہمیں دریدا کی سوانح میں دیکھنا ہوگا۔

15 جولائی 1930ء (Geoffrey Bennington & Jacques Derrida 1993,325) کو ایم آرن پسپر اور جیور جیٹ سلطانہ اسطر سفر کے گھر ژاک دریدا الجیریا کے شہر البیار میں پیدا ہوا۔ بچے کا نام والدین کی طرف سے جیکی دریدا رکھا گیا جسے بعد میں دریدا نے خود تبدیل کر لیا۔ چونکہ دریدا کا خاندان یہودی تھا اس لیے اسے مذہبی نام عیلی (Alie) سے بھی نوازا گیا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ (بقول دریدا) اس نام کا اسے بہت بعد میں علم ہوا۔ (Jacques Derrida 2004,82) دریدا کی زندگی میں لسانی، ثقافتی اور مذہبی حوالہ مختلف نوعیت رکھتا تھا۔ کیوں کہ الجیریا میں کئی قومیں آباد تھیں۔ ہر قوم کے پاس اپنا تشخص تھا۔ نتیجتاً لسانی کشمکش الجیریائی باشندوں کا مقدر ٹھہرا۔ چوں کہ دریدا کا خاندان ہسپانیہ سے ہجرت کر کے آیا تھا اور یہاں بھی انہیں فرانسیسی نوآبادکاروں کی طرف سے فرانسیسی شہریت سے نواز دیا گیا۔(Jacques Derrida 2004,85) اس لیے ثقافت کا معاملہ بھی ان کے لیے نازک تھا۔ اس پس منظر کے ساتھ ژاک دریدا کے تشخصی معاملے پر غور کیا جائے تو وہ اور زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ وہ بچپن ہی میں یہودیت کے خلاف شدید ردعمل اختیار کر چکا تھا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتا ہے کہ یہودی لوگ (رسومات کو) ظاہری طور پر تو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے مگر روحانی حوالے سے بانجھ تھے۔(Jacques Derrida 2004,81-82) تیرہ سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد ہر بچے کو یہودی مذہب کے مطابق Bar-Mitzvah کی رسم ادا کرنی تھی۔ یہ رسم یہودی خاندانوں میں ناگزیر اور معمول کی بات تھی۔ دریدا کی عملی زندگی میں مذہب کا عمل دخل

اسی رسم کی حد تک تھا۔ایسا اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ وہ عمر بھر یہودی تعلیمات سے محروم رہا۔اس نے اپنے مذہب کی زبان عبرانی نہیں سیکھی تھی۔اسی لیے وہ یہودیوں کی کتاب ''تلمود'' نہ پڑھنے پر بھی افسوس کرتا ہے۔(Jacques (Derrida 1995,80

اگر دریدا کی سوانح پر مزید نظر ڈالی جائے تو اس کے غیر متعصب یہودی ہونے کی اگلی دلیل یہ ہے کہ جب وہ مارگوریٹ سے شادی کرنا چاہتا تھا تو اسے اپنے خاندان کی طرف سے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا کیوں کہ اس کی ہونے والی بیوی عیسائی تھی۔دریدا کے خاندان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ان کی آئندہ نسل کا مذہب تھا۔جس کا حتمی حل دریدا نے یہ تجویز کیا کہ جب بچے بالغ ہو جائیں گے تو اپنی منشا کے مطابق جو مذہب اختیار کرنا چاہیں گے کر لیں گے۔(Benoit Peeters 2013, 91)علاوہ ازیں جب دریدا کی وفات ہوئی تو اس کی میت کے ساتھ بیوی کو ایک خط بھی موصول ہوا۔جس میں (مرنے والے کی طرف سے) تاکید کی گئی تھی کہ زیادہ لوگوں کو جمع کرنے کے بجائے ، یہودی رسومات کے مطابق فرانس کی اہم یونیورسٹی Ecole normale suerieure کے قرب میں واقعہ قبرستان میں اسے دفنا دیا جائے۔البتہ اس کی قبر یہودی قبروں کے لیے مختص جگہ سے باہر ہی بنائی جائے۔تا کہ وہ موت کے بعد بھی اپنی بیوی مارگوریٹ کو اپنے پہلو میں جگہ دے سکے۔(Benoit Peeters 2013,540) کسی متعصب یہودی سے ان باتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ان شواہد کی بنیاد پر پروفیسر فضیل جعفری کی بات بے معنی ہو جاتی ہے۔

پروفیسر فضیل جعفری صاحب کا دوسرا اعتراض لاتشکیل (Deconstruction) کے حوالے سے ان کی تفہیم کو واضح کر رہا ہے۔تقریر اور تحریر کے رشتے کی مناسبت سے وہ کہتے ہیں کہ دریدا نے صوت مرکزیت کے حوالے سے مغربی فلسفے پر بے بنیاد اعتراض اٹھایا ہے۔کیوں کہ جب سے آدمی نے لکھنا سیکھا ہے تقریر کی فوقیت از خود ختم ہو گئی ہے۔تحریر کے مقابلے میں تقریر کو کبھی بھی سند کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا۔لاتشکیل کا معمولی سا طالب علم بھی جانتا ہے کہ بات اس قدر سادہ نہیں ہے۔مطلب دریدا کے ہاں معاملہ تحریر کو بطور سند قبول کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کی اصل اہمیت واگزار کرانے کا ہے۔

تاریخی تناظر میں یہ بات مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان نے پہلے بولنے کا آغاز کیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ہی ارتقائی سفر طے ہوا اور الفاظ تحریری صورت اختیار کرنے لگے۔انسانی اظہار میں اس منطق کو بنیاد مانا جاتا ہے۔تاریخی اصول کی بنیاد پر تقریر کا تحریر سے رشتہ فطری سمجھا جاتا ہے۔اسی فطری رشتے کے حوالے سے دریدا کا یہ کہنا ہے کہ تقریر کو ضرورت سے کہیں زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔تقریر کو انسانی ذہن نے غیر فطری ترجیح دی ہے۔چوں کہ تقریر میں بولنے والے کی موجودگی بات کو زیادہ پر تاثیر بنا دیتی ہے اس لیے انسانی ذہن اس موجودگی کا عادی ہو گیا ہے۔وہ تحریر میں بھی اسی موجودگی کو ضروری خیال کرتا ہے۔موجودگی کی اس منطق کو دریدا موجودگی کی مابعد الطبیعات (Metaphysics of Presence) سے تعبیر کرتا ہے۔اس کا دعویٰ ہے کہ افلاطون سے لے کر اس

کے اپنے عہد تک موجودگی کی مابعد الطبیعات ہی معنی کو سچ کے التباس میں ڈھال کر حتمی پیرایہ عطا کرتی ہے۔ساسیر جس کی ساختیاتی فکر کا از سرِ نو جائزہ لے کر دریدا لاتشکیل کے فلسفے تک پہنچا تھا۔دریدا کا خیال ہے کہ وہ بھی اس نکتے کو نہ سمجھ سکا۔اس نے بھی مکمل طور پر تقریر کی بالادستی کو تحریر سے ختم نہیں کیا تھا۔اس کے حوالے سے وہ لکھتا ہے:

''مغربی روایت تھیوری کی حد تک ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی (اصول کے اطلاق کی وجہ سے) تقریر اور تحریر کے درمیان رشتوں میں مکمل جکڑی ہوئی ہے،ساسیئر بھی اس عمل کو محدود اور ماخوذ ہی سمجھ پایا۔''(Jacques Derrida 1997,30)

خواہ کوئی مغربی ہو یا مشرقی، کسی بھی مفکر کی گرفت کی جا سکتی ہے لیکن اس کے لیے (مجبوراً ہی سہی) اس کی فکر کو صحیح طور پر سمجھنا ضروری ہے۔دریدا کی فکر پر کڑی تنقید کرنے والوں میں سے ایک ٹیری ایگلٹن نے دریدا کے حوالے سے ایک جگہ(Terry Eagleton 1981,137) لکھا تھا کہ دریدا ایسا بونا ہے جو کسی بھی دیوقامت مفکر کو زمین پر پٹخ سکتا ہے۔جو شخص ژاک دریدا کو بونا لکھ سکتا ہے اور جس کی بیشتر تحریریں لاتشکیلی فکر کے حوالے سے سخت موقف رکھتی ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ دریدا کی فلسفیانہ کوتاہی اس کی نظر سے چوک گئی ہو اور پروفیسر فضیل جعفری کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

پروفیسر فضیل جعفری صاحب کا دریدا کے حوالے سے تیسرا اعتراض یہ تھا کہ وہ فلسفیانہ تربیت کے باوجود فلسفے کا استاد نہیں تھا۔بلکہ صرف اس کمیٹی کا رکن تھا جس کا کام فلسفے کی نصابی کتابیں تیار کرنا تھا۔ان کی رائے کا پہلا حصہ دریدا کے استاد ہونے یا نہ ہونے سے متعلق ہے۔اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ 1960ء سے اپنی موت 9 اکتوبر 2004ء تک دریدا مختلف وقتوں میں مختلف یونیورسٹیوں سے فلسفے کے استاد کی حیثیت میں منسلک رہا۔عمر کے اس حصے میں اس کی طویل ترین تقرری فرانس کی اہم یونیورسٹی Ecole normale suerieure میں بطور استاد رہی۔ یہ عرصہ بیس سال پر محیط تھا۔پروفیسر فضیل جعفری صاحب کی رائے کے دوسرے حصے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دریدا صرف اس کمیٹی کا حصہ تھا جس کا کام فلسفے کا نصاب مرتب کرنا تھا۔یہ بات جزوی طور پر درست ہے تاہم یہ کمیٹی جس نے فلسفے کا نصاب مرتب کرنے کے لیے تجاویز پیش کی تھیں۔یہ کوئی سرکاری یا جامعاتی سطح پر بننے والی کمیٹی نہ تھی۔ بلکہ فرانسیسی حکومت کی طرف سے دائیں بازو سے منسلک فکر نے جب فرانس میں فلسفے کی تدریس کو محدود کرنے کی باضابطہ کوششیں کیں۔تو ان کے ردعمل میں GREPH(The Group The Reserches Sur i Enseignement Philosophique) نام کی تنظیم قائم ہوئی۔اس تنظیم کو بنانے والوں میں دریدا کے قریبی دوست:ژاں لک نانسی،سارا کوفمان اور فیلپ لاکو وغیرہ شامل تھے۔(Jason Powell 2006,113) فلسفے کی تدریس کے حوالے سے دریدا نے جو تین فیصلہ کن اقدامات تجویز کیے تھے وہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ جامعاتی سطح پر تدریسِ فلسفہ کے حوالے سے مناسب عرصہ مختص کیا جائے۔

۲۔ چھٹی جماعت یا ثانوی تعلیم کے کسی بھی درجے میں فلسفیانہ علم کے لیے اوّلین تربیت فراہم کی جائے۔

۳۔ ثانوی تعلیم میں تدریس کے لیے ایک ہزار سے زائد اساتذہ کی بھرتی کو یقینی بنایا جائے۔(Jacques Derrida 1995,331)

عین ممکن ہے درج بالا سفارشات جس انٹرویو میں پیش کی گئی ہیں وہ پروفیسر فضیل جعفری صاحب کی نظر سے گزرا ہو جس کی بنیاد پر انہوں نے دریدا کو فلسفے کا استاد سمجھنے کے بجائے فقط کمیٹی کا حصہ سمجھ لیا ہو۔اب پروفیسر صاحب کے چوتھے نکتے کی طرف آتے ہیں جس میں انہوں نے اکتوبر 1966ء میں منعقد ہونے والی جان ہاپکنز کانفرنس کو امریکی سرمایہ دار ہنری دوئم کے حکم سے منعقد بتایا ہے۔اس بارے میں پورے وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔البتہ اس کانفرنس کا موضوع،شرکاء کی فہرست اور دریدا کے مقالے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آیا یہ کانفرنس امریکی اسٹیبلشمنٹ کی جانب سے تھی یا نہیں۔

اس کانفرنس کا انعقاد The Languages of Criticism and The Sciences of Man کے موضوع پر کیا گیا تھا۔اس کا اہتمام جان ہاپکنز یونیورسٹی کے دو پروفیسروں رچرڈ ماکسی اور اینجینیو دونا تو نے کیا تھا نہ کہ ہلس ملر اور پال دی مان نے۔اس کانفرنس کے اہتمام میں،ان دونوں کے پیش نظر فرانسیسی فکر میں رونما ہونے والی حالیہ تبدیلیوں کا احاطہ کرنا تھا۔کانفرنس کے موضوع سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اس وقت تک فرانس میں اہم سمجھی جانے والی زبان کی تھیوری ساختیات سے متعلق تھی۔اور ساختیات کی بحث امریکہ کے دانش کدوں کے لیے بالکل نئی تھی۔اس کانفرنس میں جن مہمانانِ گرامی کو مدعو کیا گیا تھا۔ان میں لوسیاں بنا کو،ژارژ پولے،ژاک لاکان، ژاں-پیئر ورننٹ، رولاں بارتھ،ژاں ہیپولیت،گولڈ مین اور ژاک دریدا وغیرہ کے نام شامل تھے۔(Benoit Peeters 2013,166)

کانفرنس کا موضوع ساختیات ہی تھا۔کیوں کہ دریدا کے علاوہ باقی شرکاء بالخصوص رولاں بارتھ کے نام سے بھی اسی خیال کو تقویت ملتی ہے۔اب اس بات کو فرض کر لیتے ہیں یہ کانفرنس امریکی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے منعقد کی گئی تھی۔چنانچہ تمام شرکاء پر لازم ہے کہ وہ پہلے سے طے شدہ موضوع پر ہی مقالہ پڑھیں گے۔پڑھنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا۔جو انوکھی بات کر کے سب کو حیران کر دے۔سب اپنے مقالات میں جس ساخت یا ساختیت کی اہمیت کو اجاگر کر رہے ہوں کوئی اسی ساخت کو حدف بنائے کسی اسٹیبلشمنٹ کی طرف سے منعقدہ کانفرنس میں تو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔دریدا کے مقالے میں یہی منفرد بات تھی۔کانفرنس کے تیسرے روز اس نے ساخت کے متفقہ ڈھانچے میں شگاف (Rupture) دکھایا۔دریدا نے "Structure, Sign and Play in the Discourse of Human sciences" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔وہ ساختیات،جس کی تفہیم کے لیے کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔دریدا نے (امریکہ میں) اس کے آغاز پر ہی اس کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔اس مضمون میں دریدا نے ساختیات پر تابڑ توڑ حملے کیے۔اپنے مقالے میں وہ کہتا ہے۔

''یہ واضح کرنا کافی آسان ہے کہ ساخت کا تصور اور حتٰی کہ لفظ ساخت بھی اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ

علم کا نظریہ (episteme) یعنی یہ مغربی سائنس یا فلسفے کے برابر ہی قدامت رکھتا ہے۔ساخت کے تصور کی بنیادیں رائج زبان میں بہت اندر تک پیوست ہیں لیکن اب یہ بنیادیں ،نظریہ علم (episteme) سے دست بردار ہو رہی ہیں اور مجازی معنوں میں اپنی جگہ سے سرک رہی ہیں۔تاہم یہ واقعہ (Event) پر منحصر ہے جسے میں نشان زَد اور واضح کرنا چاہتا ہوں۔اگرچہ ساخت (یا ساخت کی ساختیت بھی) ہمیشہ حد بندی قائم کرتی آئی ہے لیکن یہ حد بندی اس لیے قائم ہوتی تھی کہ ساخت ہمیشہ موجودگی کے مرکز (Point of presence) کی طرف لاتی ہے۔یہ ایک ایسا مرکز ہے جو طے شدہ آغاز (Origin) رکھتا ہے۔'' (Jacques Derrida 2005,351)

دریدا کی رائے سے یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ اس نے موضوع کی پاسداری نہیں کی اس لیے یا تو یہ کانفرنس امریکی اسٹبلشمنٹ کی طرف سے نہیں تھی یا پھر وہ اس قدر ہٹ دھرم واقع ہوا تھا کہ اسے انتظامیہ کی طرف سے قائم کردہ حدود کا بھی پاس نہ رہا۔پروفیسر صاحب اپنے پانچویں نکتے میں کہتے ہیں کہ تھیوری اور ''ردتشکیل'' کے پیچھے امریکی اسٹبلشمنٹ تھی اس لیے اسے اخباروں اور رسالوں کے ذریعے بھی پھیلایا گیا۔پروفیسر صاحب کی اس رائے سے بھی جزوی طور پر اتفاق کیا جا سکتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ لاتشکیل یا خود دریدا کو بھی اخبارات وغیرہ میں کافی جگہ ملتی رہی ہے۔لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا یہ اہمیت جان ہاپکنز میں ہونے والی کانفرنس کے فوری بعد ملنے لگی یا اس سے کئی سال بعد۔اگر تو اس کانفرنس کے کئی سالوں بعد تک بھی دریدا قعرِ گمنامی میں پڑا رہا۔تو بعد میں ملنے والی شہرت کے اسباب کچھ اور ہو سکتے ہیں۔

جان ہاپکنز یونیورسٹی میں کانفرنس اکتوبر 1966ء میں منعقد ہوئی تھی جب کہ اپریل 1981ء میں فرانس سے شائع ہونے والے ماہوار ادبی جریدے "Lire" میں ایک سروے شائع ہوا۔اس میں فرانس کے 136 مشہور فلسفیوں کے نام شامل تھے۔سرفہرست نام لیوی اسٹراس کا تھا جب کہ مشل فوکو اور ژاک لاکان کے نام بھی اس فہرست کا حصہ تھے۔لیکن دریدا کا نام کہیں نہیں تھا۔(Benoit Peeters 2013,349) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک امریکہ تو کیا فرانس کہ جس ملک کی ایک بڑی یونیورسٹی میں تقریباً دو دہائیوں سے وہ فلسفہ پڑھا رہا تھا اور فرانسیسی زبان میں ہی اس کی بیشتر کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں۔وہاں کوئی اس کو بطور فلسفی نہیں جانتا تھا۔پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عام آدمی سے اس کی شناسائی کب ہوئی؟ وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے اخبارات اور رسائل بھی اس کے لیے اظہار کا وسیلہ بن گئے؟ اس ضمن میں دو واقعات خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

پہلا واقعہ 1981ء کے اختتام پر رونما ہوا۔جب Force of law کے مصنف (دریدا) کو چیک ری پبلک کے دارالحکومت پراگ میں ایک رات جیل میں گزارنا پڑی۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ 1980ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں اساتذہ کے ایک گروہ نے Jan Hus Educational Foundation کی بنیاد رکھی۔اس تنظیم کا

مقصد چیکوسلواکیہ کی یونیورسٹیوں میں راز داری سے مخصوص موضوعات پر کلاسوں اور سیمیناروں کا اہتمام کرانا تھا۔ ان سرگرمیوں میں ایسی کتابوں پر گفتگو کو ممکن بنانا تھا جن پر چیک حکومت نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ المختصر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا بھر کی جامعات سے متعلق خرد ور طبقے ایسے موضوع میں دلچسپی لے رہے تھے جو چیک انتظامیہ اور وہاں کے دانشوروں کے درمیان تنازعے کی نوعیت رکھتا تھا۔ اس سارے منظر نامے میں دانشورانہ کردار ادا کرنے کی غرض سے دریدا نے کئی بار چیکوسلواکیہ کا سفر کیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھ کر اسے تنظیم کا نائب صدر منتخب کر لیا گیا۔ (Benoit Peeters 2013,332) اسی تنظیم کی دعوت پر وہ 26 دسمبر 1981ء کو ایک سیمینار میں شرکت کی غرض سے چیک ری پبلک کے دارالحکومت پراگ گیا۔

پراگ پہنچتے ہی دریدا کو گمان گزرا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اس نے سیمینار سے بالواسطہ سیاسی خطاب کیا۔ اس نے ڈیکارٹ کی زبان سے متعلق بات کی۔ یہ گفتگو وہاں کی سیاسی و سماجی صورتحال کے حوالے سے اس قدر مبہم تھی کہ شرکاء میں سے ایک کو پوچھنا پڑا کہ اس قسم کا فلسفہ ہماری موجودہ حالت سے کس طور مطابقت رکھتا ہے۔ گفتگو کے اختتام پر بات سمیٹتے ہوئے اس نے ائیر پورٹ سے ہوٹل تک تعاقب کیے جانے کے احساس پر فلسفیانہ اصطلاحات کی مدد سے رائے دی۔ تاہم اس کے میزبانوں نے بڑی سہولت کے ساتھ مقتدرہ کے اس عمل کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ انہوں نے مائیکروفون اور ریکارڈ کیے جانے کا خوف بھی محسوس نہ کیا۔ اس پریشان کن صورتحال کے پیش نظر دریدا نے 29 دسمبر یعنی سیمینار کے آخری روز اس میں شرکت سے معذرت کر لی۔ اگلے دن دوپہر کے وقت وہ ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ ائیر پورٹ پر اس کے سامان کا بغور جائزہ لینے کے بعد کسٹم آفیسروں کی طرف سے اسے مطلع کیا گیا کہ اس کے سامان سے منشیات برآمد ہوئی ہیں۔ اسے نزدیکی تھانے لے جایا گیا۔ جب یہ خبر فرانس پہنچی تو وہاں اس کی رہائی کے لیے دانش وروں کی جانب سے دستخطی مہم کا آغاز کر دیا گیا۔ سڑکوں پر بھی اس کے حق میں مظاہرے شروع ہو گئے۔ فرانسیسی صدر فرانسوا متغواں (Francois Mitterrand) کی براہ راست مداخلت کے بعد فوری طور پر ۳۱ دسمبر کی رات کو اسے جیل سے رہائی ملی۔ (Benoit Peeters 2013,336) یکم جنوری 1982ء کو جب اس نے پیرس کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس کے استقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پر سینکڑوں کی تعداد میں اس کے طلبا اور دوست عوام کے ساتھ موجود تھے۔ اس واقعے نے ژاک دریدا کو فرانس کے عوام میں غیر معمولی شہرت دلا دی۔

دریدا کو اخبارات اور رسائل میں جو شہرت ملی دریدا کی سوانح میں اس کا دوسرا محرک ہم جس واقعے کو قرار دے سکتے ہیں۔ اس کا آغاز 1992ء میں مارچ کے مہینے سے ہوا۔ ہوا کچھ یوں کہ دریدا کو کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کرنے کا اعلان کیا گیا۔ اس اعلان کے بعد دنیا بھر کے دانشورانہ حلقوں میں ایک نئی بحث کا آغاز ہو گیا۔ اس بحث میں میڈیا نے خاص طور پر دلچسپی لی۔ اعزازی ڈگری کے حوالے سے اساتذہ اور خرد ور طبقے کے مابین اختلاف تھا۔ اس لیے کیمبرج یونیورسٹی کی طرف سے 16 مئی 1992ء کے دن خفیہ رائے

شماری کا فیصلہ کیا گیا۔ اس رائے شماری کے عمل سے قبل ہی برطانیہ سے شائع ہونے والے اخبار "The Times" میں "A Question of Honor" کے عنوان سے ایک کھلا خط شائع ہوا۔ اس خط میں مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ۱۹ فلسفیوں اور اساتذہ نے یونیورسٹی کے اس اقدام کی مذمت کی۔ اعزازی ڈگری کے نوازے جانے کی مخالفت کرنے والوں میں اس وقت کا اہم ریاضی دان غینی تھوم (Rene' Thom) اور امریکہ سے تعلق رکھنے والا اہم فلسفی کوائن (W.V.O. Quine) بھی شامل تھے۔ اس خط کے مطابق ان مخالفت کرنے والوں کا خیال تھا کہ دریدا انکاریت پسند ہے۔ اس کا فلسفہ درحقیقت فلسفے کے مستند ضابطوں سے عدم مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے ہاں بہت سے منطقی مغالطے ہیں اس لیے وہ مذکورہ ڈگری کی عطا کے لیے مناسب مفکر نہیں ہے۔ (http://ontology.buffalo.edu/smith/varia/derrida_letter.html) اس سب کے باوجود 16 مئی 1992ء کو کیمبرج یونیورسٹی نے رائے شماری کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اعزازی ڈگری ژاک دریدا کو ہی عطا ہونی چاہیے۔ یونیورسٹی کے اس اقدام کی تائید میں 336 ووٹ پڑے جبکہ تردید کرنے والوں کی تعداد 204 تھی (Simon Glendinning 2011,13)۔

اسی سال اکتوبر میں The Cambridge Review نے اعزازی ڈگری والے معاملے پر دریدا کا ایک انٹرویو چھاپا۔ اس انٹرویو سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسے اس بات کا ادراک تھا کہ جو جنگ بظاہر میڈیا پر اس کے خلاف جاری تھی اس کی بنیادیں اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مراکز سے زیادہ ان تعلیمی اداروں میں پیوست تھیں۔ جہاں اس کی فکر کو دانستاً غیر مقبول بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے فلسفے پر لگے اعتراضات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جس شخص نے میرے کام کا سرسری مطالعہ ہی کر رکھا ہو وہ بھی مجھے انکاریت پسند قرار نہیں دے سکتا۔ یہ الزام بغیر حوالے کے لگایا گیا۔ اسی لیے یہ رائے کسی کتاب یا مضمون کی صورت میں نہیں دی گئی بلکہ میڈیا کے ذریعے ایک خط کی شکل میں دی گئی ہے۔ (Jacques Derrida October 1992,131-132)

چوں کہ دریدا کے خلاف خط اخبار میں چھپا تھا اس لیے اس واقعے کے بعد تو دریدا کو دنیا بھر کے اخبارات میں چھاپا جانے لگا تا کہ اس کا موقف دنیا کے سامنے آ سکے۔ ساتھ ہی مختلف وقتوں میں اسے پرنٹ میڈیا کے علاوہ ٹیلی ویژن پر بھی دکھایا جانے لگا۔ اس کی غیر معمولی موجودگی کی وجہ سے یہ تاثر ابھر سکتا ہے کہ اس کی شہرت کے پیچھے امریکی اسٹبلشمنٹ تھی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ امریکہ کے سب سے بڑے دشمن ملک روس کے آدرشی: کارل مارکس کے حوالے سے دریدا نے اس وقت قلم اٹھایا جب دیوار برلن بھی گر چکی تھی۔ دریدا کی اس نئی فکری وابستگی نے 1993ء کے اختتام پر "Specters of Marx" میں مارکس اور اس کی زبان کی حمایت پر سب کو حیران کر دیا۔ کیونکہ یہ ایک ایسا وقت تھا۔ جب امریکی مقتدرہ نے مارکس کی فکر کو منسوخ کر کے (اپنے تئیں) دفنا دیا تھا۔ اس کتاب کے حوالے سے فریڈرک جیمسن کا خیال تھا کہ اس کتاب میں دریدا نے دنیا کی صورتحال پر بات کی ذمہ داری اٹھائی

ہے ۔ وہ زندہ حیثیت میں مکمل اختیار کے ساتھ انوکھے اور قیامت خیز خاکے کو واضح کررہا ہے ۔(Fredric Jameson 2008,26)

تحقیقی بنیادوں پر پروفیسر فضیل جعفری کے بیانات کی صحت کو جانچنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اختلاف اگر دلیل سے کیا جائے تو وہ متنازعہ شخص یا اس کی فکری تفہیم میں امکانات کا پیش خیمہ ہوگا۔لیکن اس وقت کیا ہوگا جب اختلاف کرنے والا نقاد،مصنف سے بغض پر اتر آئے اور کتاب میں موضوع بننے والی علمی شخصیات کو اس لیے رگیدنا شروع کر دے کیوں کہ انہیں مخالف مصنف نے موضوع بنایا ہے۔ پروفیسر فضیل جعفری صاحب کے طویل مضمون میں ایسا ہی نظر آرہا ہے۔کم از کم ژاک دریدا کی حد تک تو یہ بات اب یقین سے کی جا سکتی ہے ۔تاہم باقی مغربی مفکرین سے متعلق آراء کو بھی تحقیقی بنیادوں پر جانچنے کی ضرورت ہے۔ضرورت کا جواز اس امر میں مضمر ہے کہ اردو زبان میں ان مغربی مفکرین کی زندگیوں کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس تشنگی پر مستزاد وہ سنگین الزامات ہیں جو فکر کے مذکورہ حوالوں کو بھی مشکوک بنا رہے ہیں۔وہ تمام مغربی مفکرین جن کو گوپی چند نارنگ صاحب نے اپنی کتاب میں موضوع بنایا ہے اور جن کو پروفیسر فضیل جعفری صاحب نے متنازعہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔وہ لوگ مغربی تنقید،فلسفے اور علم وادب میں اہم سنگِ میل سمجھے جاتے ہیں۔ان لوگوں کی فکر سے تائید یا تردید کی نوعیت خالصتاً علمی یا مکالماتی ہونی چاہیے۔کیوں کہ اس صورتِ حال کو دوسرے (Other) کی حیثیت سے مشاہدہ کرنے والا اس کے مکمل تناظر کے ساتھ کچھ اس طرح جانچ سکتا ہے کہ اس کے اپنے تناظر پر اس صورتِ حال کا تناظر اثر انداز نہ ہو۔مطلب یہ کہ دوسرا خود مختار حیثیت میں اپنی اصلیت واگزار کرائے۔اردو ناقدین کی طرف سے مکالمے کا بنیادی وظیفہ شاید یہی ہونا چاہیے۔

ماٰخذ:

1. Benoit Peeters. *Derrida(A biography)* trns. by Andrew Brown. Malden :Polity Press, 2013.

2. Daniel Bell, *The End of Ideology: On The Exhaustion of Polotical Ideas in the Fifties*. London: Harvard University Press, 1960.

3. Francis Fukuyama. *The End Of History and the Last Man.* New York: The Free Press, 1992

4. Fredric Jameson. "Marx's Purloined Letter", in *Ghostly Demarcations*, Edited by Michael Sprinker, 2nd Edition, London & New York: Verso Publications, 2008.

5. Geoffrey Bennington & Jacques Derrida. *JACQUES DERRIDA*, trns. by Geoffrey Bennington, Chicago & London: The University of Chicago Press, 1993.

6. Jacques Derrida, " Sending: On Representation," trns. by Peter Caws & Mary Ann Caws. *Social Research* 49, No.2,(1982): 294-326.

7. Jacques Derrida. "Viewpoint: An Interview with Jacques Derrida," in The Cambridge Review 113, No.2318(1992): 131-139.

8. Jacques Derrida. *Points* (Interviews,1974-1994) Edited by Elisabeth Weber, Trans. by Peggy Kamuf & Others. Stanford, California: Stanford University Press, 1995.

9. Jacques Derrida. *Of Grammatology*, trns. by Gayatri Chakravorty Spivak, 2nd Edition, Baltimor & London: The Johns Hopkins University Press, 1997.

> "On the one hand, true to the Western tradition that controls not only in theory but in practice (in the principle of its practice) the relationships between speech and writing Saussure does not recognize in the latter more than a narrow and derivative function."

10. Jacques Derrida. *Counterpath (Traveling with Jacques Derrida)* Catherine Malabou and Jacques Derrida, trns.by David Wills. Stanford, California: Stanford University Press, 2004.

11. Jacques Derrida. *Writing and Difference*, trns. by Alan Bass, 2nd Edition, London & New York: Routledge Press, 2005.

> "It Would be easy enough to show that the concept of structure and even the word "structure" itself are as old as the episteme --that is to say as old as western science and western philosophy -- and that their roots thrust deep into the soil or ordinary language, into whose deepest recesses the episteme plunges in order to gather them up and to make them part of itself in a metaphorical displacement. Nevertheless, up to the event which i wish to mark out and define, structure --or rather the structurality of structure -- although it has always been at work, has always been neutralized or reduced, and this by a process of giving it a center or of referring it to a point of presence, a fixed origin."

12. Jason Powell. *Jacques Derrida: A biography*. New York & London:

Continuum Publishing Group, 2006.

13. Jean Francois Lyotard. *The Postmodern Condition: A report on Knowledge,* trns. by Geoff Bennington & Brian Massumi. Minneapolis: University of Minnesota Press, 1984.

۱۵۔ پروفیسر فضیل جعفری۔آبشار اور آتش فشاں۔نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان،۲۰۰۷۔

16. Simon Gildon. *Derrida :A Very Short Introduction*. New York: Oxford University Press, 2011.

17. Terry Eagleton. *Walter Benjamin: Towards a Revolutionary Criticism.* London: Verso Publication, 1981.